احفاظ الرحمٰن

وقت نے نیا رجسٹر کھول لیا ہے

جنرل (ر) پرویز مشرف کے خلاف چارج شیٹ تیار تھی۔ انہوں نے وقت کا بازو جھٹکنے کی ٹھانی تھی، لیکن چاروں طرف اُمڈتی آندھیوں نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ وقت خاموشی سے اپنی دستاویز تیار کرتا جاتا ہے۔ جو اسے آنکھیں دِکھانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے لیے ایک سفّاک آئینہ ڈھالتا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں رہتے ہیں۔ سارا حساب کتاب اسے ازبر رہتا ہے۔ فراموشی کا کوئی خانہ اس کی زنبیل میں نہیں ہوتا۔ کوئی فریب اسے نابینا نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا جاتا ہے، سنتا جاتا ہے، اور پھر وہ گھڑی آ جاتی ہے، جب اس کا فیصلہ آسمان پر نقش ہو جاتا ہے۔ تب فریب کار کو احساس ہوتا ہے کہ سورج سوا نیزے پر آ چکا ہے، اور اس کی تمازت سے اس کا وجود موم کے مانند پگھلتا ہوا مٹی پر مضحکہ خیز شبیہیں بنا رہا ہے۔

وقت رحم دل بھی ہوتا ہے۔ جس سینے کے اندر درد چُھپا ہوتا ہے، وہ اسے سُکون کی خوش بُو سے مہکائے رکھتا ہے۔ اسے بے خوابی کے راہ زن سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے دل کی دُنیا کو ناداروں، مجبوروں، مظلوموں کے لیے تڑپنے کی اَن مول دولت سے نوازتا ہے، جابروں اور ظالموں کے خلاف لڑنے کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ اس کی ہتھ کڑی کو گُرز کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی گویائی کو طوفان کے آہنگ میں منقلب کر دیتا ہے۔

گویا، وقت ایک ایسا سخت گیر مُنصف ہے، جس کی گرفت سے بچ نکلنے کا خواب دیکھنے والا فریب کاریوں، حماقتوں اور خام خیالیوں کو اپنا مسکن بناتا ہے۔ جنرل (ر) پرویز مشرف بھی حماقتوں اور خام خیالوں کے خرابے میں مبتلا رہنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اسی لیے ان کے تکبّر پر ظلم کا رنگ بڑی تیزی سے چڑھا، اور وہ خود کو ''ناقابلِ تسخیر'' گرداننے لگے۔

وقت ان کے تکبّر کی آواز سنتا رہا، ان کی آنکھوں میں جھلکتی سفّاکی کا نظارہ کرتا رہا، اور اس کے ساتھ اپنی چارج شیٹ بھی تیار کرتا رہا۔ پھر وہ زور سے ہنسا اور اس نے اپنا فیصلہ ہوا کی لہروں پر بکھیر دیا۔

کون سنتا ہے؟

کون دیکھتا ہے؟

کون عبرت پکڑتا ہے؟

کون اقتدار اور اختیار کے نشے سے بچنے کی تدبیر کرتا ہے؟

یہاں یہ قصّہ رُوپ بدل بدل کر بار بار طلوع ہوتا ہے، بار بار غروب ہوتا ہے، بار بار اعلان کرتا ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

لیکن اس خرابے میں جس کا نام پاکستان ہے، کسی کو سننے، دیکھنے اور عبرت پکڑنے کی فرصت نہیں ہے۔ دولت اور اختیار کا نشہ چڑھتا ہے تو چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ دولت والے ناداروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اختیار والے مجبوروں اور محکوموں کی کھوپڑیوں کے مینار پر اپنی عظمت کا ستارہ نصب کرتے ہیں، اپنے ہاتھوں اور دماغوں کو ناقابلِ تسخیر شمار کرتے ہیں۔ اپنی برتری کے گیت گاتے ہیں، اور اپنے بدمست رقص سے دُنیا کا سُکون غارت کرتے ہیں۔

لیکن وقت ہنستا رہتا ہے۔ اس کی انگلیاں ہر دم حرکت میں رہتی ہیں۔ سارا حساب کتاب اسے ازبر ہوتا ہے۔ پھر وہ گھڑی آ جاتی ہے، جب دولت اور اختیار کے پُجاری کے سامنے وقت کے ہاتھوں کا تراشا ہوا سفّاک آئینہ آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ جاتا ہے، پناہ کی تلاش میں وہ کبھی زمین کو اور کبھی آسمان کو دیکھتا ہے، لیکن وقت کے نقارے کی گونج چاروں سمتوں میں اس کے لیے زنجیروں کا جال بچھا دیتی ہے۔

سزا جزا سب یہیں پہ ہوگی

یہیں پہ یومِ حساب ہوگا

کیا وقت کی انگلیاں کوئی اور چارج شیٹ تیار کرنے میں مصروف نہیں ہوں گی؟

وقت کو قرار کہاں، وہ تو ہر دم مستعد اور متحرک رہتا ہے۔ کوئی بھی لمحہ اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ جو اسے آنکھیں دِکھائے گا، وہ اس کے لیے سورج کو سوا نیزے پر اُتار لائے گا۔ جو ناداروں اور محکوموں کی اُمنگوں کے سامنے فریب کا علم بلند کرے گا، اسے چاروں طرف سے اُمڈتی ہوئی آندھیوں کی سیاہیوں میں غرق کر دے گا۔

وقت سخت گیر مُنصف بھی ہے، اور اس کے سینے میں دردمندی کا خزانہ بھی چُھپا ہوا ہے۔ وہ ظالموں اور جابروں کا دشمن ہے اور مجبوروں اور محکوموں کا طرف دار۔ پرویز مشرف اپنے انجام کو پہنچے، وقت نے ان کی کتاب کا آخری باب مکمل کر دیا۔ اب اس نے ایک نیا رجسٹر کھول لیا ہے۔ اس رجسٹر میں نئے حکم رانوں کا حساب درج ہو رہا ہے۔ کون رعونت اور تکبّر میں مُبتلا ہوگا، کون اپنے عہد و پیمان سے وفا کرے گا، کون مجبوروں، محکوموں کی اُمنگوں پر اپنے فریب کا زخم لگائے گا۔ کون امیروں، کبیروں کی عیاشیوں کو لگام دے گا۔ کون غریبوں اور ناداروں کی سسکتی بلکتی آنکھوں پر دردمندی اور انصاف کے لمس سے آشنا کرے گا۔ وقت دیکھ رہا ہے اور سُن رہا ہے۔ اس کی انگلیاں سب کا حساب تیار کر رہی ہیں۔ وہ کسی کو حماقتوں، خام خیالیوں اور فریب کاریوں کی خود ساختہ جنّت میں شاد و آباد نہیں رہنے دے گا۔ اور جس سینے کے اندر ناداروں، مجبوروں اور محکوموں کے لیے تڑپنے کا جذبہ چھلک رہا ہوگا، وہ اسے سکون کی خوش بُو سے معمور رکھے گا۔

سو، نئے حکم رانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر انہوں نے فریب کاری کا راستہ اختیار کیا تو ان کے سر اوپر بھی بجلی کڑکڑ کر کے گرے گی۔ وقت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ فراموشی کا کوئی خانہ اس کی زنبیل میں نہیں ہے۔

وقت نے نیا رجسٹر کھول لیا ہے۔اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر جسٹس افتخار محمد چوہدری کے سر کے وہ بال چسپاں ہیں، جو پرویز مشرف کے اہل کاروں نے نوچ کر زمین پر پھینک دیے تھے۔اس پر قابلِ فخر جسٹس خلیل رمدے اور ان کے 59 ساتھیوں کی تصویریں بھی چسپاں ہیں، جنہیں برطرف کر کے بچوں سمیت محبوس رکھا گیا۔اور یہ صفحہ اعتزاز احسن، منیر ملک، حامد خان، علی احمد کُرد اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان کے ہزاروں صداقت شعار ساتھیوں کی بے مثل جدوجہد کی خوش بُو سے مہک رہا ہے، جنہیں اس ملک کے مظلوم عوام نے بڑی چاہت سے اپنے سینوں میں آباد رکھا ہے۔

وقت سب دیکھ رہا ہے، سب سن رہا ہے۔اس کے رجسٹر میں اس ملک کے مظلوم مُنصفوں کی ساری فریادیں درج ہیں، اور اس میں نئے حکم رانوں کے پُرانے اور نئے تمام وعدوں کی داستان بھی درج ہے۔سب کی تمنّا یہی ہے کہ پرویز مشرف کے ظلم کا باب بند ہونے کے بعد یہاں انصاف کا سورج پوری آب و تاب سے چمکے، مظلوموں کو انصاف ملے، پرویز مشرف کے جابرانہ فرمان کا نشانہ بننے والے منصفوں کو ان کا حق ملے، اور عدلیہ کو سچّی آزادی۔

سب کی تمنّا یہی ہے کہ پُرانے اور نئے وعدوں کو شرم ساری سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اپنا وار ضرور کرے گا۔وہ چارج شیٹ تیار کرتا رہے گا، پھر ایک دن وہ زور سے ہنسے گا اور اپنا فیصلہ ہوا کی لہروں پر تحریر کر دے گا۔

(تاریخ اشاعت: 26 اگست 2008)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احفاظ الرحمٰن

لشتم پشتم

حالات بتا رہے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت ابھی ایک طویل عرصے تک لڑکھڑاتی رہے گی، اور اس کے سر پر مسلسل خطرات منڈلاتے رہیں گے۔عام انتخابات کے بعد بھی منظر اس قدر روشن نہیں ہوا کہ اس پر فخر کیا جا سکے۔سیاسی میدان میں شدید کش مکش کے آثار نمایاں ہیں، اور اختلافات کی ہوا آندھی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔سب کی خواہش ہے کہ چھم چھم بوندیں برسیں اور سارا گرد و غبار غائب ہو جائے۔ہر دردمند دل اس خواہش کی خوش بُو سے مہک رہا ہے۔لوگوں نے آمریت سے نجات پانے کے لیے بڑی لگن سے جدوجہد کی ہے۔انہوں نے ہنستے مسکراتے خواب دیکھے ہیں۔ان کے تصور میں آسودہ حالی، امن اور محبت اور انصاف کی تصویریں رقص کر رہی تھیں، جب انہوں نے طبلِ جنگ کی مسحور کُن لَے پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر گیت گائے تھے، دمکتے چہروں کے ساتھ فضا میں نعرے بُلند کیے تھے اور اُمید کے نخلستان اور نا اُمیدی کے صحرا کے درمیان، اپنے دل کا دیا بُجھنے نہیں دیا تھا۔ایک دن ساری پریشانیاں دُور ہوں گی، اور سارے خواب اپنی منزل سے آسودہ ہوں گے، انہوں نے یہی خواب دیکھا تھا۔

خوش اُمیدی کا پودا مُرجھانا نہیں چاہیے، بادِ مخالف کچھ اور پیغام سُناتی دِکھائی دیتی ہے، لیکن خواب دیکھنے والوں، سچّائی، امن اور انصاف کے تمنّائیوں کو اس کا مقابلہ جاری رکھنا چاہیے۔جدوجہد کا مسئلہ رکھنا چاہیے۔لیکن یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس جدوجہد کا مقصد جمہوری اقدار کی تکمیل میں مضمر ہے۔یہ عمل جاری رہنا چاہیے۔اسی عمل کے دوران جمہوری روایات کو فروغ حاصل ہوگا، جس کا خواب ہم نے ساٹھ سال سے اپنی آنکھوں میں آباد رکھا ہے۔جاگیردارانہ نظام کی پروردہ سیاست کے طفیل بہت سی امیدوں کے شیشے چکنا چُور ہوئے ہیں۔آمریت کے خلاف جمہوریت کی لڑائی، لڑنے کے دعوے داروں نے ہمیں موقع پرستی اور مفاد پرستی کے ناقابلِ یقین مناظر سے دوچار کیا ہے۔اس لیے نیک امیدوں کے باوجود مستقبل میں سیاسی خلفشار بڑھنے کے امکانات عیاں ہوتے جا رہے ہیں۔وکلاء کی جس شان دار جدوجہد کے سائے میں ملک کے کونے کونے میں احتجاج اور بغاوت کا شعلہ روشن ہوا تھا، اسے زیر کرنے اور ناکام بنانے کی تدبیریں جاری ہیں۔ان تدبیروں کے تار و پود بکھیرنے کے لیے جمہوریت پسند حلقوں کو عزم اور حوصلے کے ساتھ سچّائی کا علم بلند رکھنا چاہیے، چال بازیوں کو بے نقاب کرتے رہنا چاہیے۔ہم نے اس راہ میں بہت زخم کھائے ہیں، لیکن گذشتہ ساٹھ سال کے دوران ہماری دُنیا میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔سب سے اہم اور پُراثر تبدیلی یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی وسعت کے ساتھ عوام کو معلومات فراہم کرنے والے ذرایع کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔بحث و تمحیص کے نئے افق روشن ہوئے ہیں۔پہلے ہر بے ایمان کسی بھی قول و فعل کی تردید آسانی سے کر سکتا تھا۔اب یہ ورزش آسان نہیں رہی ہے۔سارے ثبوت پل بھر میں، چُٹکی بجاتے میں سامنے رکھ دیے جاتے ہیں۔اور جب تردید کرنے والا ان ثبوتوں کو جُھٹلانے کی کوشش کرتا ہے تو لوگ گھروں میں، سڑکوں پر، گلی کوچوں میں اس کی اس ہٹ دھرمی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی، علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ تہذیب کے سفر میں اب منزلیں زیادہ آسانی سے سر ہوں گی۔لوگوں کی آنکھیں اب تیزی سے کُھلیں گی۔وہ جان جائیں گے کہ فریب کی دُنیا میں خاموش تماشائیوں کا کردار ادا کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ان کے ذہنوں میں وہ سوالات اب زیادہ تیزی سے گردش کریں گے، جنہیں اب تک انہوں نے زیادہ شدّت سے نہیں اُٹھایا تھا:

ہمارے معاشرے میں ظلم اور ناانصافی کے اسباب کیا ہیں؟

ہمارے سیاسی نظام پر جاگیرداروں کا غلبہ کیوں ہے؟

ہمارے قانون ساز اداروں پر پُشت در پُشت مراعات یافتہ طبقوں کا قبضہ کیوں برقرار ہے؟

ہمارے ہاں کروڑوں لوگ پُشت در پُشت ناداری کی بھٹی میں کیوں سُلگ رہے ہیں، اور مُٹھی بھر اُمراء عیش و عشرت کے سارے وسائل کے اجارہ دار کیسے بن بیٹھے؟

ہماری ریاست میں طاقت اور دولت کا راج کب ختم ہوگا، انصاف فراہم کرنے والے ادارے کو مفلوج اور تابع مہمل بنانے کی سازش کب تک جاری رہے گی؟

کروڑوں، اربوں روپے لُوٹنے والے کب تک سُرخ رو رہیں گے؟

ہماری سیاست اور معیشت کو امریکی سام راج کی غلامی سے آزادی کب اور کیسے حاصل ہوگی؟

دُکھ کے بادل کب پگھلیں گے، کب سُکھ کا ساگر چھلکے گا؟

مجبور بُڑھاپا کب تک سُونی راہوں میں دھول پھانکے گا، معصوم لڑکپن کب تک گندی گلیوں میں بھیک مانگے گا، حق مانگنے والوں کو کب تک آہنی بیڑیوں کا تحفہ ملتا رہے گا؟

کب تک؟

یہ سوالات طوفان بن کر اُٹھیں گے، اور اِن کا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا!!

سوالات مختلف حلقوں کی جانب سے، اور مختلف رنگوں میں اُٹھائے جائیں گے، اور ان کے حل بھی مختلف زاویوں سے پیش کیے جائیں گے۔ تاہم، انہیں اس ظالمانہ نظام کی بیخ کنی اور جمہوری اقدار کی سربلندی کے مقصد سے جُڑے رہنا چاہیے۔ بعض حلقے یہاں بار بار فوجی مداخلت کو دعوت دیتے ہیں، جس شاخ پر بیٹھتے ہیں، اُسی پر بے دردی سے کلہاڑا چلاتے ہیں۔ فوجی آمریت کے ہاتھوں اتنے زخم کھانے کے بعد بھی اسے اپنی امیدوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیتے ہیں۔ جب وہ آتی ہے تو تالیاں بجا بجا کر اپنے ہاتھ سُرخ کر لیتے ہیں، اس کے ساتھ اقتدار میں شراکت کرتے ہیں، اور جب وہ اپنے پنجے پھیلاتی ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک ہلاکت آفریں عمل ہے، اس لیے جو لوگ یا جو حلقے اس رُجحان کے فروغ کا باعث بنتے ہیں، ان کی سختی سے مذمت کی جانی چاہیے۔

تاہم، اس بیمار معاشرے میں مذکورہ تمام بُرائیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کو جو غریب اور متوسط طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، زیادہ دردمندی اور خلوص کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ سیاسی پارٹیاں مضبوط اور باشعور ہوں گی تو کسی بھی آمر کو شب خون مارنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ سیاسی پارٹیاں اس وقت مضبوط ہوں گی، جب یہ احساس جاگے گا کہ وہ مضبوط نہیں ہیں، کیوں کہ ان کی نکیل کسی ایک یا دو چار اشخاص کے ہاتھوں کی قیدی بنی ہوئی ہے۔ جمہوریت کے دعوے داروں کے درمیان خاندانی حکم رانی (جو متعدد سیاسی پارٹیوں میں رائج رہی ہے) کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ اگر یہ سلسلہ جاری ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پارٹیوں میں باشعور اور ذہین کارکنوں کا کال ہے، اسی لیے انہیں آگے بڑھنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے دو چار لوگ اگر آگے آنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں تو یہ ثمر بھی اوپر بیٹھے مقتدر شخص یا اشخاص کے ہر جائز و ناجائز فعل کی تائید کا صلہ ہوتا ہے۔ ایسے میں خوشامدیوں یا اندھے عقیدت مندوں کی فوج تو تیار ہو سکتی ہے، جس کے فرائض کھوکھلی نعرہ بازی تک محدود ہوں، ایسے باضمیر اور دردمند کارکن تیار نہیں ہو سکتے، جو خود اپنی پارٹیوں کی صفوں میں بیٹھ کر سچّی اور بے لاگ تنقید کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔

اگر سیاسی پارٹیوں کی اپنی صفوں کے اندر جمہوریت نہیں ہوگی اور خود تنقیدی کے عمل کو فروغ حاصل نہیں ہوگا تو ملک میں جمہوریت کا مستقبل بھی محفوظ نہیں ہوگا۔ اگر جمہوریت کو مستقل بنیادوں پر تحفظ فراہم کرنا مقصود ہے تو سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کو اپنے اندر خود شناسی کا جذبہ بیدار کرنا ہوگا۔ انہیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ان کی پارٹی نے مذکورہ بالا سوالات کا حل پیش کرنے کے لیے دُرست سمت کا انتخاب کیا ہے یا نہیں۔ اور انہیں اس قابلِ نفرت سسٹم سے نجات حاصل کرنے کے لیے پوری قوت سے جدوجہد کرنی ہوگی، جس کے تحت صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی جیسے اداروں میں متمول خاندانوں کے افراد پُشت در پُشت منتخب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر سیاست کا بازار پیسے والوں کی تماشا گری کا ہدف بنا رہے گا، نچلے اور متوسط طبقات کے کارکنوں کو یوں ہی استعمال کر کے ردّی کی ٹوکری میں پھینکا جاتا رہے گا، فیصلہ سازی میں ان کے خیالات کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوگا تو جمہوریت کسی بھی صورت مستحکم نہیں ہوگی۔ وہی ہوگا، جو پہلے ہوتا رہا ہے!!

(تاریخ اشاعت 7 ستمبر 2008)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احفاظ الرحمٰن

سفید و سیاہ

ہمارے ہاں ہر بیان میں کوئی نہ کوئی صفتِ عالیہ ضرور در آتی ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کسی شخصیت سے لگاؤ کا اظہار مقصود ہے تو اس کے لیے ''عظیم ترین'' کا سابقہ لگانا ضروری قرار پاتا ہے، خواہ وہ شخصیت اوسط درجے ہی کی کیوں نہ ہو۔ گویا، اس لنکا میں جو بھی ہے باون گز کا ہے۔ کوئی نیچے آنے کو تیار نہیں۔ اپنے وطن سے کون محبت نہیں کرتا، اس کی مٹی تو ہر شخص کی سانسوں میں مہکتی ہے اور دل کی ہر دھڑکن میں دھڑکتی ہے۔ لیکن اس مٹی سے جنم لینے والے ہر وجود کو ''عظیم ترین'' قرار دینا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کو ان کے عقیدت مندوں نے آسمان پر چڑھایا، لیکن وہ پاتال میں جا گرے۔ کیا کیا صفات ان سے منسوب نہ ہوئیں... عالی دماغ، اعلیٰ مدبر، بہترین منتظم، انتہائی دردمند غرض یہ کہ لغت میں درج ہر صفت کا پھول ان کی وردیوں پر ٹانک دیا گیا۔ یہ لوگ اس وعدے کے ساتھ طلوع ہوئے کہ عوام کو خوش حالی اور ترقی کے دریا سے سیراب کر دیں گے، لیکن انہیں غلاظتوں کے جوہڑ میں پھینک کر غروب ہو گئے۔ پھر ان کی صفاتِ عالیہ کے گُن گانے والے معتقدین پر یہ راز عیاں ہوا کہ وہ ''عظیم ترین'' نہیں، بلکہ خود غرض اور مفاد پرست تھے۔ ان دنوں پرویز مشرف بھی اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ایک ایک کر کے سارے ''سنگی ساتھی'' اُڑن چُھو ہو گئے۔ یہاں تک کہ چوہدری شجاعت حسین بھی کہہ رہے ہیں کہ پرویز مشرف نے ان کی نصیحتوں پر عمل نہیں کیا، ورنہ اُن کا یہ حشر نہ ہوتا۔ شیخ رشید زیادہ کائیاں نکلے، نئی پارٹی کا اعلان کر کے ٹھینگا دِکھا دیا۔ اور وہ جو ایک صاحب بہت چہکتے پھرتے تھے کہ نام ان کا محمد علی دُرّانی تھا، گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے۔ وصی ظفر نے تو آقا کے خلاف ''الزامات نامہ'' مشتہر کر ڈالا، اور شیر افگن جنہیں وقت بے وقت دہاڑنے کا چسکا لاحق تھا، منقار زیر پر کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ رہ گئے نثار میمن جیسے لوگ تو وہ کسی شمار قطار میں نہیں۔

پرویز مشرف کے ''دغا بازوں'' کی فہرست خاصی طویل ہے، لیکن اس میں نامی گرامی سابق جرنیلوں کے ناموں کی شمولیت اچنبھے کا باعث ہے۔ جنرل حمید گل تو عرصے سے ایک مخصوص ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں، اور انہوں نے سیاست کے تالاب کو گدلا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اب جو سابق جرنیلوں کا دستہ نمودار ہوا ہے، اس کے مطالبات عوامی اُمنگوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بہ ظاہر، ان کا ایجنڈا ایک نکاتی ہے کہ پرویز مشرف کو فوری طور پر اقتدار سے بے دخل کیا جائے، اور انہوں نے اپنے مطالبے کو کمک پہنچانے کے لیے پرویز مشرف کے خلاف ٹھوس اور سنگین الزامات کی فہرست بھی آویزاں کر دی ہے۔ اس سے پہلے ریٹائرڈ میجر جنرل احتشام ضمیر نے بھی اس بیان کے ساتھ دھماکا کر ڈالا تھا کہ 2002 کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی تھی، اور وہ اس فعل میں شرکت پر از حد نادم ہیں۔ سابق جرنیلوں کے تازہ دم دستے نے وکلاء کے لانگ مارچ میں حصّہ لینے یا اس کی حمایت کرنے کا بھی اعلان کیا ہے۔ ان کے بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ''یہ سُورما اس وقت کیوں خاموش رہے، جب وہ پرویز مشرف کی انتظامی مشینری کا حصّہ تھے۔ اس وقت ان کا ضمیر کیوں بیدار نہیں ہوا تھا۔'' بہ ظاہر، اس سوال میں جان نظر آتی ہے۔ سچ وہی ہے، جو وقت پر بولا جائے۔ جب حبیب جالبؔ نے کہا تھا کوئی تو پرچم لے کے نکلے اپنے گریباں کا

جالبؔ، تو ان کا یہی پیغام تھا کہ بہادر وہی ہے، جو اس وقت نعرہ بلند کرے، جب چاروں سمت سنّاٹا چھایا ہو۔ فوج میں ایسے دیوانے کبھی نظر نہیں آئے۔ وہاں میز کے گرد بیٹھ کر اختلافات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، لیکن جب فیصلے کا اعلان ہو جاتا ہے تو اسے من وعن تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اور اگر فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے کا فیصلہ ہو تو وہ یک زبان ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس یک زبانی نے ہمارے وطن کو جاں بہ لب کر رکھا ہے۔ اس کی تفصیل سے سب واقف ہیں۔ فوجی آمریت نے ظلم و جبر کو اس حد تک پروان چڑھایا کہ آج پورا معاشرہ درہم برہم نظر آتا ہے۔

اس پس منظر کے باوجود سابق جرنیلوں کے تازہ دم دستے کی نقل و حمل پرویز مشرف کے خلاف موجودہ جمہوری جدوجہد سے (جسے ہماری قانون داں برادری نے شعلۂ جوالہ بنا دیا ہے) ہم آہنگ ہے تو اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ یہ دیکھا جانا چاہیے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، اس نکتے پر نہیں اٹکنا چاہیے کہ وہ ماضی میں برسرِ کار تھے تو انہوں نے آواز کیوں بلند نہیں کی۔ اب ان کی مشترکہ آواز بہ ہر حال جمہوری قوتوں کے لیے سازگار کردار ادا کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر، جنرل (ر) جمشید گل زارکیانی کے انکشافات نے پرویز مشرف کی آمریت کو مزید بے نقاب کیا ہے، اور اسی فضا میں یہ مطالبہ بھی گونج رہا ہے کہ من مانے فیصلے کرنے پر پرویز مشرف کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے۔ یہی نہیں، انہوں نے NRO کو مُسترد کرنے کا بھی اعلان کیا ہے، جس کے ذریعے پرویز مشرف نے اپنے اقتدار کو طول دینے کی راہ ہموار کی تھی۔ یہ لوگ وکلاء کے لانگ مارچ میں بھی حصّہ لیں گے، جس کا مقصد عدلیہ کی بحالی ہے۔ وکلاء نے تو ابھی تک ان کے اعلان پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اور وہ کریں گے بھی نہیں۔ انہوں نے سب کو دعوت دی ہے، جو بھی شرکت کرے گا، اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ چوں کہ تم نے فلاں وقت فلاں کام کیا تھا، اس لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں چلنے دیں گے۔ پرویز مشرف کے بعض حامی ضرور برافروختہ ہیں۔ پرویز مشرف کی رُخصتی یقینی ہو چکی ہے، اس لیے اب وہ بغلیں جھانکتے ہوئے بالواسطہ انداز میں ان کی حمایت کا پہلو ڈھونڈ نکالنے کے جتن کرتے ہیں۔ سابق جرنیلوں نے بہ راہِ راست پرویز مشرف کو نشانہ بنایا ہے، اس لیے پرویز مشرف کے بچے کھچے حلقہ بگوش تڑپ اُٹھے ہیں۔ اگر ان سابق جرنیلوں نے پرویز مشرف کی حمایت میں بیان جاری کیا ہوتا تو یہ حضرات خاموش رہنے کو ترجیح دیتے۔

سابق جرنیلوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سیاست میں فوج کی دخل اندازی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جانا چاہیے۔ چلیے، یہاں تک تو پہنچے، یہاں تک تو آئے۔ یہ خنّاس تو کافور ہوا کہ فوجی سویلین سے بہتر منتظم اور دیانت دار ہوتا ہے، اس لیے اسے حکومت کرنے کا ازلی اور ابدی حق حاصل ہے۔ اس سے قبل بعض سابق فوجی انفرادی طور پر فوجی اقتدار کی مذمت کرتے رہے ہیں، لیکن اب پہلی بار سینیر ترین فوجیوں کی ایک جمعیت مشترکہ طور پر پرویز مشرف کے مواخذے اور ججوں کی بحالی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ایک خبر کے مطابق ایک اعتراض بابر اعوان نے بھی اُٹھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جمشید گل زارکیانی پارسا نہیں ہیں، نواز شریف کی حکومت غیر مستحکم کرنے میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ان کی اس ''حق گوئی'' کا راز بھی یہی ہے کہ وہ بھی فاروق نائیک اور آصف زرداری کے قریبی حلقے کے بعض دوسرے ارکان کی طرح پرویز مشرف سے مفاہمت قائم رکھنے کی وکالت کرتے رہے ہیں۔ سُنا ہے موصوف مولانا فضل الرحمٰن سے بھی قریبی موانست رکھتے ہیں، جنہوں نے فوجی آمر کی قصیدہ خوانی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواز شریف کا درد بابر اعوان کی پسلی سے کیسے برآمد ہوا۔ خود نواز شریف نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے جمشید گل زارکیانی کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے صرف یہ بیان دینے پر اکتفا کیا کہ اس سے ان تمام الزامات کی حقیقت کُھل گئی ہے، جو پرویز مشرف اور ان کے حواری میرے خلاف عاید کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے، انہیں یہی کہنا چاہیے تھا۔ وہ مستقل مزاجی کے ساتھ عدلیہ کی بحالی کے مطالبے پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جو کوئی اس مطالبے کی حمایت کرے گا، وہ اسے طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔

یہ کام تو بابر اعوان اور ان کے ہم نواؤں ہی کو راس آ سکتا ہے، جو ایک طویل عرصے سے عدلیہ کی بحالی کے معاملے کو فٹ بال کی طرح اِدھر سے اُدھر لڑھکانے میں مشغول ہیں۔ ان ''دانش مندوں'' کو شاید ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ مشغلہ ان کے لیے کس قدر مہنگا ثابت ہوگا۔ اگر ان کی سماعت کارگر ہوتی اور ان کی بینائی بانجھ نہ ہوتی تو انہیں علم ہو جاتا کہ عوام ان کے اس فریب آمیز کھیل سے عاجز آ چکے ہیں۔ سچ یہی ہے کہ ''معتوب'' ججوں نے ہماری تاریخ میں پہلی بار اپنے لیے ایک جگمگاتی راہ کا انتخاب کیا ہے۔ جو بھی اس راہ میں اندھیرے پھیلانے کی کوشش کرے گا، عوام اسے تحت الثریٰ میں دھکیل دیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احفاظ الرحمٰن

سہمے ہوئے لوگ

اس ملک میں گذشتہ چند مہینوں سے جو تماشا جاری ہے، وہ خوش گوار انجام تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ ساری علامات تباہی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ دُرست، کہ اچھی آرزو کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن جب آپ بلند چٹان کے کنارے کھڑے ہو کر آگے قدم بڑھانے پر اصرار کریں گے تو نہ آپ رہیں گے اور نہ آپ کی آرزو۔ سب کچھ چکنا چُور ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ بڑی دردمندی سے فریاد کر رہے ہیں، گڑگڑا رہے ہیں، دلائل کے انبار لگا رہے ہیں کہ موجودہ جمہوری عمل کو توانا بنانے کے لیے دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہنی چاہیے۔ لیکن طنابیں کھنچتی جا رہی ہیں اور خیمہ اُکھڑنے کے قریب ہے۔ ایسے میں اگر سیاست دانوں کے مفاد پیوستہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو لوگ آپ کو قنوطیت پسند قرار دے سکتے ہیں، بلکہ یہ الزام بھی عاید کر سکتے ہیں کہ آپ دراصل فوجی آمریت کے حامی ہیں۔ سہمے ہوئے لوگ، جو ہمیشہ انقلاب کی حقیقی راہ سے بے بہرہ رہے ہیں، اسی قسم کا ردِعمل پیش کر سکتے ہیں۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ منہ زور ہوا کا گلا گھونٹ سکتے ہیں، جو مسلسل حریفانہ چالیں چلنے میں مصروف ہے۔ ان کی سادگی کا کمال یہ ہے کہ ان کی دانست میں دونوں جماعتوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کا زیادہ تذکرہ نہیں کیا جانا چاہیے، ورنہ فاصلے بڑھتے جائیں گے، اور منزل کھوٹی ہو جائے گی۔ گویا، ان کے خیال میں یہ تذکرہ شعلوں کو ہوا دینے کے مترادف ہوگا۔

اس خوش فہمی یا خود پسندی کا کوئی جواب نہیں۔ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ کاروبارِ مملکت کا رُخ متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان پر اب تک یہ انکشاف نازل نہیں ہوا کہ اس ملک کے خوں خوار بالائی طبقات کے نزدیک ان کی رائے یا آرزو پرِ کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان طبقات کو صرف اپنے مفادات سے غرض ہے۔ وہ صرف اپنی کھالیں محفوظ رکھنے کی تدبیریں کرتے ہیں، غٹاغٹ ہماری آرزوؤں کا خون پیتے ہیں اور اپنے عشرت کدوں سے ہماری طرف تذلیل آمیز قہقہے اُچھالتے ہیں۔ انہیں کوئی خوف نہیں ہے، انہیں معلوم ہے کہ ان کے خلاف اُٹھنے والی دبی دبی مصلحت آمیز آوازیں ان کی صحت پر کوئی منفی اثر ڈالنے پر قادر نہیں ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی موقع پرستی اور مفاد پرستی کی لگامیں کُھلی چھوڑ دی ہیں۔

دبی دبی مصلحت آمیز آوازیں اس سرکشی کو سدھانے میں کیسے کام یاب ہو سکتی ہیں؟ ہاں، آج اگر انہیں یہ احساس ہو جائے کہ ان کی مفاد پرستی کے خلاف طوفان کھڑا ہو سکتا ہے تو وہ شاید اپنے اطوار درست کرنے

پر مائل ہو جائیں۔ یہ طوفان کیسے آئے گا، جب کہ بیش تر سیاسی پارٹیاں ان ہی مفاد پرست طبقات کی گرفت میں ہیں۔عوام کسی طوران کی پالیسیوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، کیوں کہ یہ طبقات انہیں بیدار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔اور سول سوسائٹی کے جو ارکان ان دنوں وکلا کی تحریک میں شامل ہیں، اس قدر قوت اور استعداد نہیں رکھتے کہ معاشرے میں کوئی انقلاب برپا کر سکیں۔ان کی سرگرمیاں محض چھوٹی موٹی ریلیوں، سیمیناروں اور میڈیا کو جاری کردہ بیانات تک محدود ہیں۔عوام النّاس کی آبادیوں تک ان کی رسائی نہیں ہے، جو اگرچہ ناخواندہ اور نیم ناخواندہ ہیں، لیکن بہ ہر حال معاشرے کے غالب جزو کی تشکیل کرتے ہیں۔ایک زمانہ تھا کہ آمریت اور ناانصافی کے خلاف شہروں اور دیہات کی گلیوں سے جلوس نکلا کرتے تھے، جن میں محنت کش لوگ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔اب اس عمل کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔پریس کلبوں کے سامنے جمع ہو کر مزاحمت کا علم لہرانا ایک مضحکہ خیز عمل ہے۔میڈیا والوں کے سامنے تصویریں کھنچوانے اور بلند بانگ تقریریں کرنے کا عمل یا یاب پانیوں میں سفر کرنے کے مترادف ہے، اور اس کے پیچھے نام و نمود حاصل کرنے کی خواہش بھی کسی قدر نمایاں نظر آتی ہے۔بہ ظاہر اور فی الوقت گہرے سمندر میں اُترنے کی یہ لوگ استعداد اور حوصلہ نہیں رکھتے۔معاشرے میں معنی خیز اور حقیقی تبدیلی لانے کے لیے موجودہ سیاسی نظام کا ڈھانچا توڑنا ہوگا، جس کے ذریعے استحصالی طبقات کی حکم رانی کا سلسلہ برقرار ہے۔ایسا انقلاب لانے کے لیے گہرے سمندر کا سفر کرنا ہوگا، گلیوں کوچوں کو مزاحمت اور بغاوت کی ضرورت سے آشنا کرنا ہوگا۔عوام النّاس کو یہ درس دینا ہوگا کہ وہ تمام علاقائی، فرقہ وارانہ اور لسانی تعصّبات سے بالاتر ہو کر ان طبقات کے خلاف جنگ کریں، جنہوں نے انہیں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی محروم کر رکھا ہے۔حقیقی جمہوریت تو اسی طرح تشکیل پذیر ہو سکتی ہے۔اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ آرزو بڑی خوب صورت ہے کہ دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان اتحاد بہ ہر صورت برقرار رہنا چاہیے، لیکن اس نام نہاد اتحاد کے نام پر جو چال بازیاں سامنے آ رہی ہیں، انہیں بروقت بے نقاب کرنا ضروری ہے۔انہیں چُھپانے یا ان کی ہلاکت آفرینی پر پردہ ڈالنے اور ''اتحاد'' کا وظیفہ پڑھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔سچ وہی ہے جو وقت پر بولا جائے، بعد از وقت سچ بولنا موقع پرستی کے مترادف ہوتا ہے۔وقت پر سچ بولا جائے گا تب ہی چال بازیاں کرنے والوں کو خوف محسوس ہوگا کہ لوگ ان کی نشست و برخاست پر نظر رکھتے ہیں، اور ان کی چالوں کو پہچانتے ہیں، خواہ انہیں کتنے ہی خوش نما لبادے میں لپیٹ کر پیش کیا جائے۔

بدقسمتی سے آغاز ہی گم راہ کُن ثابت ہوا۔اس خوف سے کہ کہیں پرویز مشرف کی آمریت کے خلاف جمہوریت کے لیے لڑنے والی قوتیں کم زور نہ پڑ جائیں، ان کی بے قاعدگیوں اور قانونی انحرافات کو جمہوریت پسندوں نے آسانی سے قبول کر لیا۔مثال کے طور پر، یہ پاکستان جیسے ملک ہی میں ہو سکتا تھا کہ NRO کے تحت معتوب سیاست دانوں کے خلاف تمام مقدمات واپس لے لیے گئے۔ان مقدمات کی تیاری پر حکومت نے کروڑوں ڈالر صَرف کیے، دُنیا بھر میں ان کی تشہیر کی، اور پھر ایک فردِ واحد، پرویز مشرف نے معافی کے پروانے ان کے ہاتھ میں تھما دیے۔انہیں کس قانون نے یہ اختیار دیا تھا؟ معافی پانے والوں اور فیض اُٹھانے والوں نے ہنستے گاتے ہوئے اسے قبول کر لیا۔انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔لیکن سول سوسائٹی کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔اس نے یہ سوال کیوں نہیں اُٹھایا کہ اس معاملے کا فیصلہ کُھلی عدالت میں ہونا چاہیے، جہاں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو اپنے حق میں بیان دینے اور گواہیاں پیش کرنے کی آزادی حاصل ہو۔اگر مدعا علیہ بے قصور ثابت ہو تو اس کے خلاف مقدمہ خارج کر دیا جائے، اور مدعی کو ان کی کردار کشی کرنے کے جُرم میں قرار واقعی سزا دی جائے، بہ صورت دیگر، مدعا علیہ کو مروجہ قانون کے تحت سزا بُھگتنے کا حکم جاری کیا جائے۔اگر سول سوسائٹی تمام احمقانہ مصلحتوں سے بالاتر ہو کر واشگاف انداز میں یہ مطالبہ کرتی تو شاید حالات اس قدر خراب نہ ہوتے۔اسی طرح لندن، بھوربن اور دبئی میں ہونے والے معاہدوں کی خلاف ورزی پر پُر زور الفاظ میں مذمت کی جانی چاہیے تھی، جو نہیں ہوئی۔اس کے برعکس انتہائی مبالغہ آمیز انداز میں آصف زرداری کو ''بہترین مدبر'' اور ''مردِ کامل'' کے روپ میں پیش کیا گیا، اور ان کی ''بصیرت'' اور ''معاملہ فہمی'' کو خوب خوب خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔چناں چہ اس ردِعمل کے بعد وہ مزید خود پسندی میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ یہ اعلان بھی صادر فرمایا کہ میں قائداعظم محمد علی جناح اور ذوالفقار علی بھٹو کی طرح عظیم تاریخی شخصیت بننا چاہتا ہوں۔پاکستان کی قسمت میں ابھی نہ جانے کیا کچھ سننا اور دیکھنا لکھا ہے۔سننے والے سنیں گے اور دیکھنے والے دیکھتے جائیں گے تو ڈرامے کے خود پسند کردار خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ تماشائی ان کی پرفارمینس سے خوش اور مطمئن ہیں۔احتجاج نہیں ہوگا تو وہ اپنی اصلاح سے بے نیاز رہیں گے۔ورنہ پاکستان اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر اور سسک سسک کر چلتا رہے گا یا اس سے بھی بدتر انجام سے دوچار ہو سکتا ہے۔

(تاریخ اشاعت: 6 جولائی 2008)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احفاظ الرحمٰن

سفید و سیاہ

سڑکوں سے یارانہ

قائدِ اعظم مسلم لیگ کے وفادار، پرویز مشرف کے جاں نثار، نثار میمن نے تازہ ترین بیان میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم پاکستان کے فیصلے سڑکوں پر نہیں کرنے دیں گے۔واضح طور پر ان کا اشارہ وکلا کی اس جدوجہد کے خلاف ہے، جو اب ''لانگ مارچ'' کی شکل میں اپنی استقامت کا ایک اور ولولہ انگیز منظر پیش کر رہی ہے۔دوسری طرف رحمان ملک، بابر اعوان، احمد مختار اور شیری رحمان کے بیانات بھی معاندانہ رنگ میں اُجاگر ہوتے رہے ہیں، اگرچہ ان بیانات میں خواہ مخواہ اصول پرستی کا تڑکا لگانے کی ناکام کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔نثار میمن تو تخت و تاج کے زیرِ سایہ اُگے، اس لیے ان کا بیان قطعاً غیر متوقع نہیں۔وہ پرویز مشرف سے حد درجہ عقیدت رکھتے ہیں، ان کے گُن گاتے ہیں۔اگر وہ چلے گئے تو یہ بے چارے زیرو+زیرو کی تفسیر بن کر رہ جائیں گے۔ان کا کوئی حلقۂ انتخاب بھی نہیں کہ مستقبل میں اپنے لیے بہار کا کوئی امکاں تلاش کر سکیں۔ان کی بہار تو پرویز مشرف کے دم قدم سے ہے، وہ گئے تو یہ سوکھے پتے میں تبدیل ہو جائیں گے۔سو، ان کا خوف حق بجانب ہے۔وکلاء کی تحریک کے نتیجے میں پرویز مشرف کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا تو انہیں بھی بوریا بستر باندھنا پڑے گا۔اسی لیے کہتے ہیں کہ ''پاکستان کے فیصلے سڑکوں پر نہیں کرنے دیں گے۔'' گویا، پاکستان کے فیصلے ہوس پرست، اقتدار پسند ٹولوں کے محلات کی سانپوں سے بھری میزوں پر ہوتے رہیں تو یہ خوشی کے شادیانے بجاتے رہیں گے۔سڑکوں پر تو معتوب اور مظلوم لوگ نکلتے ہیں۔سڑکوں کے سچّے دوست تو عوام ہوتے ہیں، جو اپنے جلتے پیروں اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ ان پر اپنی محرومیوں کی آگ میں جھلستی زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں، اور ان کی ہر سانس کے ساتھ یہ نعرہ بلند ہوتا ہے کہ طاقت اور دولت کے نشے میں مدہوش لُٹیرو، ہم انصاف طلب کرتے ہیں، ہمیں جینے کا

حق دو۔چمکتی دمکتی کاروں سے ہم پر استہزائی قہقہوں کے فوارے اُچھالنے والو،تمہارے اندر ایسا کون سا وصف ہے کہ تم عیش وعشرت کی مست ہواؤں میں جُھومتے رہو،اور ہماری جان توڑ محنت،مشقت کے اندر ایسی کون سی خرابی ہے کہ ہم خوشی کی چند بوندوں کے لیے بھی ترستے ہیں۔

اور اُن ہی کے درمیان مُنّو بھیل کا نڈھال،غم زدہ چہرہ اُبھرتا ہے،اور سوال کرتا ہے،میں سڑک چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ اقتدار کی حویلیوں میں عبداللہ یوسف کے نسائی رقص سے لُطف اندوز ہونے والوں نے میری فریاد نہیں سنی،ایک آدمی نے مجھے نیچے سے اُٹھا کر سینے سے لگایا۔اسے نکال دیا گیا،اور اب میں ایک بار پھر اپنی حسرتوں کی ویران قبر سینے سے لگا کر حیدر آباد پریس کلب کے باہر سڑک پر آ بیٹھا ہوں،اس اُمید میں کہ کبھی تو تھر کی دھرتی جل تھل ہوگی،جہاں سے منتخب ہونے والا وزیر اعظم اپنی سیاہیوں کی پٹاری سمیٹ کر لندن،پیرس اور نیویارک کی خواب ناک فضاؤں میں اپنے ناکارہ،خود غرض وجود کے اندر مئے عیش کی بوتلیں اُنڈیل رہا ہے۔سب مجھے دُھتکارتے ہیں،حیدر آباد پریس کلب کے سامنے سے گزرنے والی سڑک مجھے پناہ دینے کے لیے ہر بار اپنی بانہیں پھیلا دیتی ہے۔سو،اسی سے میرا یارانہ ہے۔میں اُسے اپنی آپ بیتی سُناتا ہوں،اپنے بچوں کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہوں تو وہ میرے آنسو پونچھتی ہے،میری آنکھوں میں اُمید کا دِیا روشن کرتی ہے،کہتی ہے،غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا،کس کے روکے رُکا ہے سویرا۔

پاکستان میں پھیلے ہوئے،سڑکوں کے کروڑوں دوستوں کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی فریاد کی لَے مدھم نہ ہونے دیں،اپنی جدوجہد کا دیا بُجھنے نہ دیں،کیوں کہ اسی جدوجہد کا نام زندگی ہے،اپنے لیے،سب کے لیے انصاف طلب کرنے کا نام زندگی ہے۔

ایک طرف سڑکوں کے دوست ہیں اور دوسری طرف سڑکوں کے دشمن۔سڑکوں کے دوست متاعِ درد لُٹاتے ہیں،اپنے سینے روشن رکھتے ہیں،اور سڑکوں کے دشمن چند روزہ زندگی کو دفترِ بے معنی میں غرق کر دیتے ہیں،سیاہیوں کے سمندر میں غسل کرتے ہیں اور اپنے چہروں کی تاب ناکی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔سو،اگر اقتدار پر فائز لوگ وکلاء کی موجودہ تحریک کو مطعون کرنے کے لیے قسم قسم کے دلائل تراش رہے ہیں تو وہ اپنی فطرت کا تقاضا بہ حُسن وخوبی پورا کر رہے ہیں۔تاب ناک چہروں والے رحمٰن ملک،فاروق نائیک اور بابر اعوان (اور ان کے ہم نوا) جو کچھ کہتے ہیں،وہ ان کی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اقتدار میں آنے کے بعد یہاں ہر کوئی سڑکوں کے دوستوں کو دھمکیوں کی زد پر رکھتا ہے،شرافت سے بات کرو،جلسے کرو گے،جلوس نکالو گے تو ہمارا ''قانون'' حرکت میں آنے پر ''مجبور'' ہوگا۔تم انصاف کو سربلند دیکھنا چاہتے ہو،تو ہم بھی انصاف کے نام لیوا ہیں۔فرق یہ ہے کہ ہم ذرا ''سلیقے'' سے اپنی اس محبت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں،تم بے ڈھنگے ہوئے جاتے ہو۔اور یہ جو تم نے ''انصاف انصاف'' کی رٹ لگا رکھی ہے،اس رٹ میں کیا رکھا ہے۔کیا اِس سے زندگی کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے؟ آٹا سستا ہو جائے گا،زندگی کے سارے اسباب سستے ہو جائیں گے؟ یہ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے کہ منصفی کی مسند پر فائز رہنے والے بھی جلوسوں میں شرکت کر رہے ہیں۔اور جہاں تک وکلاء کا تعلق ہے،وہ سازش کا شکار ہوئے جاتے ہیں۔ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ عدلیہ ضرور بحال ہوگی،لیکن یہ مان کر نہیں دیتے،خواہ مخواہ ہمارے دامن پر شبہات کے چھینٹے نقش کرتے ہیں۔کہتے ہیں،ہم بار بار اپنا موقف تبدیل کر رہے ہیں۔آخر ہم کب تک برداشت کریں گے،اتہام تراشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے،انہیں اپنے دائرے میں رہنا چاہیے۔بادب بانصیب،بے ادب،بے نصیب۔کوئی حد بھی ہوتی ہے،اب سابق جرنیلوں اور سابق بیوروکریٹوں نے بھی ان کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ہمیں یقین ہے کہ وہ کسی ''خاص'' ایجنڈے کے تحت وکلاء کی صفوں میں گھسنا چاہتے ہیں۔نادان وکلاء کی قیادت ان کی آلۂ کار بن سکتی ہے۔یہ لوگ ہمیں وقت نہیں دینا چاہتے۔الزام دھرتے ہیں کہ ہم پرویز مشرف اور جارج بُش سے خوف کھاتے ہیں،ڈرتے ہیں کہ کہیں NRO کا جنازہ نہ اُٹھ جائے۔سُو رما بنتے ہیں کہ ہم مسلسل سوا سال سے جدوجہد کر رہے ہیں۔لیکن ہماری قربانیوں کے سامنے ان کی جدوجہد پرِ کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ہم ان کے دباؤ میں نہیں آئیں گے،اپنی راہ کا انتخاب خود کریں گے،کسی قسم کی بلیک میلنگ میں نہیں آئیں گے۔

دوسری طرف پتھریلی زندگی کے عادی،سڑکوں کے دوست ہیں۔وہ جو کچھ کر رہے ہیں،وہ ان کی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔وہ کہتے ہیں،جس معاشرے میں انصاف کا ادارہ مضبوط نہیں ہوگا،وہ کسی بھی شعبے میں ترقی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔جہاں ظلم ہوگا،وہاں کے سارے درخت چھاؤں پھیلانے کی استعداد سے محروم ہو جائیں گے۔ہمارے بڑھتے قدم تھم جائیں گے تو زمانے کی سانس تھم جائے گی۔ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ تم نے جو وعدہ کیا تھا،اسے پورا کرو۔جھوٹے بیانات اور معذور دلائل کی گرد مت اُچھالو۔ہم نے کسی کا راستہ نہیں روکا۔حکومت تمہاری ہے۔سارے محکمے تمہاری تحویل میں ہیں،اور ان محکموں کے لاکھوں ملازمین تمہارے زیرِ فرمان ہیں۔انہیں حرکت میں لاؤ،آٹا سستا کرو،دالیں سستی کرو،زندگی کے سارے اسباب سستے کرو۔آخر اس نیک راہ میں کون رُکاوٹ بن سکتا ہے۔تم کہتے ہو کہ معزول جج بحال ہو جائیں گے تو کائنات کا نظام تبدیل نہیں ہو جائے گا،ظلم ہمیشہ کے لیے نیست ونابود نہیں ہو جائے گا۔ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے ایک دیا جلایا ہے،ہمارے بعد آنے والے بھی دیے جلاتے رہیں گے۔یہ آخری لڑائی نہیں ہے،جب تک سڑکوں سے محبت کرنے والے زندہ ہیں،اس وقت تک یہ لڑائی جاری رہے گی۔

سچا کون ہے؟ مٹی کی خوشبو سے آشنا سڑک یا ناداروں،مظلوموں کے لہو سے سینچی ہوئی حویلی؟ سچ یہی ہے کہ دُنیا بھر میں مٹی کی خوشبو سے آشنا سڑکوں پر آواز بلند کرنے والے گرد وغبار میں اٹے دیوانے ہی ضمیرِ آدمیت کی زبان ہیں۔انہیں کے فیض سے طاقت اور دولت کی جابرانہ حاکمیت کے مقابل ایک بازارِ عقل روشن رہتا ہے۔انسانی اقدار کی سربلندی کا خواب انہی کے دم قدم سے شاداب رہتا ہے۔سڑکوں سے ان کا یارانہ بنی نوع انسان کا سب سے قابلِ فخر اثاثہ ہے۔

(تاریخ اشاعت:15 جون 08)